اشرف المخلوقات ہونے کا راز پوشیدہ ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی جاندار عقل کلام پر قادر نہیں۔ مربوط کلام کی شرط عقل ہے اور عقل انسان ہی رکھتا ہے۔ عقل ہی امتیاز و انتخاب کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اسی سے تصور و تخیل کا ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کا علم ان سب عملیاتِ عقل کا سرتاج ہے اور وہ براہِ راست اللہ کے علم و رحمت سے انسان کو عطا ہوا ہے۔ معلوم ہوا صفتِ بیان انسانی شرف و کمال کی بنیاد ہے۔ اگر انسان اپنے دل کی بات زبان سے دوسروں تک نہ پہنچا سکتا۔ اگر اپنے نتائج فکر اور عقلی ترقی کا اظہار نہ کر سکتا تو نہ بے شمار علوم و فنون معرضِ وجود میں آتے، نہ حکمت کا سرمایہ ہوتا نہ سیاست کا اقتدار۔ نہ تمدن ہوتا نہ ایجادات۔ نہ شعر ہوتا نہ نغمہ۔ نہ قرآن کی تلاوت کے ذریعے نفوسِ انسانی ذکر کی لذت سے آشنا ہوتے اور نہ علم و حکمت کی تعلیم ہو سکتی۔

ذاتِ الٰہی تمام حسن و خیر کا سرچشمہ ہے۔ تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں۔ تمام تعریف کا وہی سزاوار ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (لقمان ۲۷) "زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں لکھنے سے ختم نہ ہونگی۔ بیشک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔"
ایک دوسری جگہ فرمایا: هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (حشر ۲۴) "وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔" چنانچہ انسانوں کو بھی حکم دیا

کہا: سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ۝ (الاعلیٰ ۱-۳) "(اے نبی) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا جس نے تقدیر بنائی اور پھر راہ دکھائی۔" ایک دوسری جگہ فرمایا۔ قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ (یونس ۳۱) "ان سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں۔ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ضرور کہیں گے اللہ۔ کہو پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے۔" قرآن نہیں کہتا کہ انسان اندھے بہرے ہو کر ایمان لائیں۔ وہ آزادئ عمل ہی کی بنا پر انسان کو لائق جزا و سزا سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (الزمر ۹) "نصیحت تو عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔" انسان کی فطرت محبت، پرستش اور علو چاہتی ہے۔ چنانچہ جس ہستی سے یہ لو لگانے سے یہ تقاضے پورے ہوتے ہیں اس کا نشان اس کی فطرت میں موجود ہے۔ قرآن نے تخلیق آدم کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَى (الاعراف ۱۷۲)۔ اللہ تعالیٰ نے روز ازل میں انسانوں کی روحوں سے فرمایا۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے جواب دیا بیشک تو ہے۔" اللہ کی ربوبیت کا اعتراف نفس انسانی کے اندر موجود ہے۔ ربوبیت کی نشانیاں آفاق میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ البتہ اس کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے۔" وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ (یوسف ۱۰۵) "زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گذرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔"

اشرف المخلوقات ہونے کا راز پوشیدہ ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی جاندار کلام پر قادر نہیں۔ مربوط کلام کی شرط عقل ہے اور عقل انسان کو دی گئی ہے۔ عقل ہی امتیاز و انتخاب کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اسی سے تصور و تخیل کا ملکہ حاصل ہوتا ہے قرآن کا علم ان سب عملیاتِ عقل کا سرتاج ہے اور وہ براہِ راست اللہ کے علم و رحمت سے انسان کو عطا ہوا ہے۔ معلوم ہوا صفتِ بیان انسانی شرف و کمال کی بنیاد ہے۔ اگر انسان اپنے دل کی بات زبان سے دوسروں تک نہ پہنچا سکتا۔ اگر اپنے نتائج فکر اور عقلی قوتوں کا اظہار نہ کر سکتا تو نہ بے شمار علوم و فنون معرضِ وجود میں آتے نہ حکمت کا سرمایہ ہوتا نہ سیاست کا اقتدار۔ نہ تمدن ہوتا نہ ایجادات۔ نہ شعر ہوتا نہ نغمہ۔ نہ قرآن کی تلاوت کے ذریعے نفوسِ انسانی ذکر کی لذت سے آشنا ہوتے اور نہ علم و حکمت کی تعلیم ہو سکتی۔

ذاتِ الٰہی تمام حسن و خیر کا سرچشمہ ہے۔ تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں۔ تمام تعریف کا وہی سزاوار ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ (لقمان ۲۷) "زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں لکھنے سے ختم نہ ہونگی۔ بیشک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔"

ایک دوسری جگہ فرمایا: هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (حشر ۲۴)
"وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔" چنانچہ انسان کو علم دیا

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝ (الاعلیٰ ۱-۳) "(اے نبی) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا جس نے تقدیر بنائی اور پھر راہ دکھائی۔" ایک دوسری جگہ فرمایا۔ قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ (یونس ۳۱) "ان سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں۔ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ضرور کہیں گے اللہ۔ کہو پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے۔" قرآن نہیں کہتا کہ انسان اندھے بہرے ہو کر ایمان لائیں۔ وہ آزادی عقل ہی کی بنا پر انسان کو لائق جزا و سزا سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (الزمر ۹) "نصیحت تو عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔" انسان کی فطرت محبت، پرستش اور علو چاہتی ہے۔ چنانچہ جس ہستی سے لو لگانے سے یہ تقاضے پورے ہوتے ہیں اس کا نشان اس کی فطرت میں موجود ہے۔ قرآن نے تخلیق آدم کا تذکرہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۚ (الاعراف ۱۷۲)۔ اللہ تعالیٰ نے روز ازل میں انسانوں کی روحوں سے فرمایا۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ روحوں نے جواب دیا بیشک تو ہے۔" اللہ کی ربوبیت کا اعتراف نفس انسانی کے اندر موجود ہے۔ ربوبیت کی نشانیاں آفاق میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ البتہ اس کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے۔" وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ (یوسف ۱۰۵) "زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔"

اشرف المخلوقات ہونے کا راز پوشیدہ ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی جاندار نطق و کلام پر قادر نہیں۔ مربوط کلام کی شرط عقل ہے اور عقل انسان ہی رکھتا ہے۔ عقل ہی امتیاز و انتخاب کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اسی سے تعقل و تخیل کا ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ قرآن کا علم ان سب عملیاتِ عقل کا سرتاج ہے اور وہ براہِ راست اللہ کے علم و رحمت سے انسان کو عطا ہوا ہے۔ معلوم ہوا صفتِ بیان انسانی شرف و کمال کی بنیاد ہے۔ اگر انسان اپنے دل کی بات زبان سے دوسروں تک نہ پہنچا سکتا۔ اگر اپنے نتائجِ فکر اور عقلی تو فکر اور عقلی توقعی کا اظہار نہ کر سکتا تو نہ بے شمار علوم و فنون معرض وجود میں آتے نہ حکمت کا سرمایہ ہوتا نہ سیاست کا اقتدار۔ نہ تمدن ہوتا نہ ایجادات۔ نہ شعر ہوتا نہ نغمہ۔ نہ قرآن کی تلاوت کے ذریعے نفوسِ انسانی ذکر کی لذت سے آشنا ہوتے اور نہ علم و حکمت کی تعلیم ہو سکتی۔

ذاتِ الٰہی تمام حسن و خیر کا سرچشمہ ہے۔ تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں۔ تمام تعریف کا وہی سزاوار ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ؁ (لقمان ۲۷) "زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں لکھنے سے ختم نہ ہوں گی۔ بیشک اللہ زبردست اور حکیم ہے۔"

ایک دوسری جگہ فرمایا: هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؀ (حشر ۲۴)

"وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے بہترین نام ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔" چنانچہ انسانوں کو حکم دیا

کہ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ ۝ (الاعلیٰ ۱-۳) "(اے نبی) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا جس نے تقدیر بنائی اور پھر راہ دکھائی"۔ ایک دوسری جگہ فرمایا۔ قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۚ فَسَيَقُولُونَ اللَّهُ ۚ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ (یونس ۳۱) "ان سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں۔ کون بے جانوں سے جاندار کو اور جانداروں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظم عالم کی تدبیر کر رہا ہے۔ وہ ضرور کہیں گے اللہ۔ کہو پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے"۔ قرآن نہیں کہتا کہ انسان اندھے بہرے ہو کر ایمان لائیں۔ وہ آزادی عمل ہی کی بنا پر انسان کو لائق جزا و سزا سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (الزمر ۹) "نصیحت تو عقل والے ہی قبول کرتے ہیں"۔ انسان کی فطرت محبت، پرستش اور علو چاہتی ہے۔ چنانچہ جس ہستی سے لو لگانے سے یہ تقاضے پورے ہوتے ہیں اس کا نشان اس کی فطرت میں موجود ہے۔ قرآن نے تخلیق آدم کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ۔ (الاعراف ۱۷۲)۔ اللہ تعالیٰ نے روز ازل ہی انسانوں کی روحوں سے فرمایا۔ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے جواب دیا بیشک تو ہے"۔ اللہ کی ربوبیت کا اعتراف نفس انسانی کے اندر موجود ہے۔ ربوبیت کی نشانیاں آفاق میں بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ البتہ اس کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: "وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ (یوسف ۱۰۵) "زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے"۔

[illegible]

اللہ کی نشانیوں کے مشاہدے سے انسان کو علم حاصل ہوتا ہے۔ ان پر غور و فکر کرنے سے ایمان راسخ اور عمل پائدار ہوتا ہے۔

مظاہر فطرت اللہ کی نشانیاں ہیں۔ قرآن نے مظاہر فطرت کا بہت سے مقامات پر خوبصورت الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے: إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ٥ (البقرہ ۱۶۲/۱۶۳) "جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے بہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اسی کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اس انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے۔ ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں بے شمار نشانیاں ہیں۔"

ایک دوسری مثال: وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ٥ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ٥ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ٥ اس کے آگے فرمایا: مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ٥ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ ٥ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ٥ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ۔ آگے فرمایا وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ٥ "زمین کو اس نے مخلوقات کے لیے بنایا اس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں۔ کھجور کے درخت ہیں۔ کھجور کے درخت جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ طرح طرح کے غلے ہیں جن میں بھوسا بھی ہوتا ہے اور دانہ بھی۔

اس نے دو سمندروں کو چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں۔ پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ پس اے جن و انس تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے۔ اور یہ جہاز اسی کے ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے اٹھے ہوئے ہیں۔"

یہ زمین و آسمان بیکار نہیں بنائے گئے ہیں۔ زندگی بے مقصد نہیں۔ مظاہرِ حیات گورکھ دھندا نہیں۔ کائنات اندھی قوتوں کی جولان گاہ نہیں۔ انسان نے عالمِ فطرت کا مشاہدہ کرکے اشیاء کے اندر ایک مشترک قانون دریافت کیا اور اس کا نام قانونِ فطرت رکھا۔ قانونِ فطرت بھی دراصل اللہ ہی کا حکم ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ (یٰس ۸۲) "وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔" قرآن نے صاف طور پر آگاہ کیا کہ کائنات بے مقصد نہیں بنائی گئی ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (الدخان ۳۸/۳۹) "آسمانوں اور زمین اور اُن کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنائی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔" یہ نہ جاننے والے مشرکین و ملحدین ہیں جنھوں نے اپنے نفس کو اپنا آلہ بنالیا ہے۔ وہ اپنی کجرویوں کو فلسفوں کا نام دیتے ہیں۔ باطل نے کیا کیا فلسفہ آرائیاں کی ہیں مگر قیاس و گمان حق سے بے نیاز نہیں کرسکتے۔ یونان والے لاتعداد دیوی دیوتاؤں پر اعتقاد رکھتے تھے۔ یہی حال اہلِ ہند کا ہے۔ ہر مظہرِ فطرت کے لیے ان کے پاس ایک دیوی یا دیوتا ہے اور حاجت روائی کے لیے الگ الگ دیوتاؤں کو پوجا جاتا ہے۔ ایک فلسفہ کی رُو سے کائنات میں مادہ کی مقدار محدود ہے اور فطرت اسی محدود مادے سے اشیاء کی تخلیق و صورت گری کرتی ہے۔ چنانچہ اشیاء اسی لیے مٹی میں مل جاتی ہیں اور

پھر مٹی میں نئی زندگی کا ظہور ہوتا ہے یہ سلسلہ تخلیق کے راز کو نہ پاکر عقیدۂ تناسخ ایجاد ہوا جو ہر تخلیق کو ایک سابقہ تخلیق کا اعادہ سمجھتا ہے۔ اس طرح روح یا سلسلۂ حیات ایک قالب کے بعد دوسرا قالب اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ شجر و حجر کی پرستش تو کھلی ہوئی بت پرستی ہے۔ بت پرستی کی بہت سی شکلیں ہیں۔ یہ اعتقاد بھی اس کی ایک شکل ہے کہ زمانہ ہی قادر مطلق ہے۔ وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ قرآن نے بالتصریح یہ فرمایا: وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝ (الجاثیہ ۲۴) "یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری زندگی ہے۔ یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے اور گردشِ ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔ درحقیقت ان کے پاس کوئی علم نہیں۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں۔" اسی طرح اکابر رجال کو الوہی درجہ دینا جس کا ہمارے زمانے میں عام رواج ہے کہ با اقتدار سیاسی رہنماؤں اور حاکموں کے مجسمے نصب کیے جاتے ہیں اور ان کی تصویریں گھروں دفتروں اور عوامی جگہوں پر آویزاں کی جاتی ہیں۔ یہ سب بت پرستی کی شکلیں ہیں۔ اسی طرح سائنس۔ آرٹ اور ایجادات کو وہ درجہ دینا جو خدا کو دینا چاہیے۔ انسان یہ سمجھنے لگا ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی بنا پر وہ خدا سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ اسے اس خبط میں مبتلا کرنے والے ایسے دانشور بھی ہیں جو دنیاوی زندگی کو مطمحِ نظر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بلکہ ایک سیاسی جابر نظام ایسے دانشوروں کو اپنے نظام کی مداحی پر مامور کرتا ہے الحادی نقطۂ نظر چاہتا ہے کہ موجودہ "زندگی" کے آگے تمام عقیدت و محبت کے جذبات پیش کیے جائیں۔ وہ زندگی کو الٰہ کا درجہ دے کر موت اور آخرت کے تصورات کو مٹانا چاہتا ہے۔ حالانکہ دنیاوی زندگی سے اس کے غم اور زوال کو ہرگز جدا نہیں کر سکتے۔ ملحد شعراء و ادباء دنیاوی زندگی کی حد سے زیادہ تعریف و توصیف کر کے یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ بس یہی دنیاوی زندگی سب کچھ ہے۔ زندگی پرستی

ایک واہمہ ہے۔ وہ دنیاوی زندگی کا ترانہ اتنی اونچی لے سے گاتے ہیں کہ انسان کے باطن میں جو عالم آخرت کا ایک احساس ہے وہ دب کر رہ جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ شعور نفس ہے ان کی وہ سرمدی صفت جو کسی دوسرے عالم کا پتہ دیتی ہے چھین لے کر ان سے دنیاوی زندگی کی حمد و تسبیح کا کام لیتے ہیں۔ عوام کی بھلائی کی فکر کرنا۔ ان کے لیے کھانا کپڑا اور مکان مہیا کرنا ہر مہذب حکومت کا فرض ہے مگر "معیار زندگی" کو اپنی تمام مساعی کا ہدف بنا کر آخرت کو فراموش کر دینا بھی ایک طرح کی بُت پرستی ہے۔ قرآن دنیاوی زندگی کی حقیقت یہ بیان کرتا ہے۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَہْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ط (الحدید ۲۰)

"خوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔"

سائنس غیر شخصی ہوتی اور اس کا طرز فکر معروضی ہوتا ہے۔ جب کہ شعر و ادب کی بنیاد جذبہ و احساس پر ہے۔ ادیب کے عقائد و رجحانات اس کے ادب کو رنگ دیتے ہیں۔ وہ اپنی باطنی کشمکش میں تنظیم فکر و خیالات سے بے نیاز نہیں ہوتا مگر وہ حقائق کا دماغ سے زیادہ قلب سے ادراک کرنا سکھاتا ہے۔ ادب و شعر یکسر معروضی نہیں ہو سکتے اور نہ ادب کو ادب رہنے دینے کے لیے یہ ضروری ہے۔ انسان ہمیشہ مظاہر کے پیچھے پوشیدہ حقیقت کی جستجو کرتا رہا ہے۔ روحِ انسانی منظر و صورت سے کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ حکمت مظاہر و صور میں معنی کی تلاش ہے۔ روح انسانی "جو ہے" پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ "کیا ہونا چاہیے" کے پیچھے ہمیشہ سرگرداں رہتی ہے۔ اور اس کی یہ سعیٔ پیہم زندگی اور صحت کی علامت ہے۔ شعر و ادب میں علامات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ عالم خیال اور عالم روحانی کے کوائف و مشاہدات کا بیان اسی طرح ممکن ہے کہ ان دیکھی چیزوں کا بیان دیکھی ہوئی چیزوں کی

مدد سے کیا جائے۔ لطافتوں کے بیان کے لیے الفاظ کی کثافتوں سے دامن بچانا مشکل ہے۔ ایک طرح سے مظاہرِ فطرت اور زندگی خود علامات ہیں حقیقت اعلیٰ کے پیچھے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فریب و التباس ہیں۔ نہیں۔ وہ اتنے ہی حقیقی ہیں جتنے ہمارے شعور و احساس۔ ہماری زندگی، ہماری آرزوئیں، ہمارے خواب۔ البتہ وہ بھی فانی ہیں اور ہم بھی فانی۔ لیکن یہ حیاتِ گذراں۔ یہ عالمِ خارجی سے ہمارا ربط، ہماری فتح و شکست، ہماری خوشی اور ہمارے غم، یہ سب پل ہیں جن پر سے گذر کر ہم ایک حیاتِ ابدی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔ یہ عظیم تر زندگی ہمارے باطن میں ہے اور وہ کامل طور پر ہماری ہو سکتی ہے جب ہم اس عارضی زندگی کے فرائض ان اصولوں کے مطابق انجام دیں جن کی طرف اشارہ ہماری فطرت کرتی ہے۔ اپنی نادانی میں انسان عالمِ فطرت کا جلال و جمال دیکھ کر مبہوت ہو گیا اور ذات خداوندی کی قدر کرنے سے قاصر رہا۔ وہ واہموں میں گرفتار ہو کر غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے معقولیت کو اس امر پر منحصر سمجھ لیا کہ جو آنکھوں سے دیکھا جائے وہی مانا جائے۔ مگر انسان کے حواسِ خمسہ کی محدودیت ظاہر ہے۔ قرآن کا ذات خداوندی کے متعلق ارشاد ہے، لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ۔ "اس کی مانند کوئی شے نہیں" ایک دوسرے مقام پر فرمایا: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (الانعام ۱۰۲) "نگاہیں اُسے نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے" چنانچہ اس دنیا میں دیدارِ خداوندی ناممکن ہے اور وہ عالمِ آخرت میں ان کو حاصل ہوگا جو اس امید میں دنیاوی زندگی بسر کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی صفات بے شمار مقامات پر بیان ہوئی ہیں۔ ہر جگہ ایک نئے مفہوم کو سمجھانے کے لیے اور زیادہ گہرے معنی کے ساتھ، قرآن کا ایک

خاص اسلوب ہے کہ کوئی بات کہنے کے بعد۔ کوئی حکم دینے، کوئی ممانعت کرنے، کوئی تاریخی واقعہ بیان کرنے یا تزکیہ و تربیت کی تعلیم دینے کے بعد ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا ذکر کرتا ہے۔ جیسے اللہ حکیم ہے۔ علیم ہے   خبیر ہے۔ سمیع ہے۔ بصیر ہے وغیرہ۔ دراصل اس سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ اس حکم، واقعہ، تعلیم یا موعظت سے اللہ کی کس خاص صفت کو تعلق ہے۔ اس خاص صفت پر غور و فکر کرنے سے معرفت و حکمت حاصل ہوتی ہے۔ صفات الٰہی قرآنی مضامین کی شاہ کلید کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر قرآن کے ان مقامات کو بہ نظر تامل دیکھیں جہاں روزہ، نماز، جمعہ، حج یا ایسے ہی دوسرے عبادات کا حکم دیا گیا ہے تو دیکھیں گے کہ اُن کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کا ذکر کرو۔ چنانچہ اس طرح ہم ذکر کے وسیع تر معنی سے آشنا ہوتے ہیں۔ زبان سے ذکر ادنیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ دل سے ذکر اعلیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ مگر سب سے اعلیٰ وہ ذکر ہے جو انسان کو اپنی یاد سے فراموش کر کے ذکر حق کے ساتھ وابستہ و زندہ کر دیتا ہے۔ یہ ذکر عملاً ذاکر کے جملہ اعمال سے ظاہر ہوتا ہے۔ اوامر کی بجا آوری ہو یا نواہی سے اجتناب۔ گھر کے معاملات ہوں یا حکومت کے قوانین۔ معاش ہو یا اقتصاد۔ شعر ہو یا ادب۔ غرض زندگی کی ہر حالت اور کیفیت سے۔ یہ ذکر، یہ عشق، حیات جاودانی بخشنے کی قوت رکھتا ہے:

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

فلسفۂ وحدۃ الوجود نے، جس کے بانی شیخ محی الدین ابن العربی ہیں، اسلامی دنیا کے عوام و خواص پر زبردست اثر ڈالا۔ یہ فلسفہ پورے عالم اسلام کے صوفیاء میں رائج ہو گیا اور چودھویں صدی عیسوی میں تو اسلامی شاعری کا مقبول ترین موضوع رہا۔ جو لوگ حلول اور خدا کی تجسیم کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس طرح وہ خدا کے ساتھ زیادہ جذبے کے ساتھ محبت کر سکتے ہیں۔ اور اُن کی آخری منزل خدا سے وصل یا

اتحاد ہے۔ مگر قرآن صاف کہتا ہے کہ خدا خدا ہے، بندہ بندہ۔ بندہ خدا سے انتہائی قرب حاصل کر سکتا ہے مگر اس کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتا۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے [illegible] یہ فلسفہ اخلاق کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور انفرادی عمل کی ذمہ داری بے معنی ٹھہرتی ہے۔ وحدۃ الوجود پر مبنی شعر و ادب نے جوشِ عمل کو سرد کیا اور انسانوں کے اندر انفعالیت پیدا کی۔ ان کو جھوٹے مزعومات میں مست رکھا۔ میدانِ عمل سے گریزاں انسانوں نے اس کے دامن میں پناہ لے کر میٹھے خواب دیکھے۔ قرآن خدا کی ایک ذات کا تصور دیتا ہے اور کہتا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (البقرہ ۱۶۵) "کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔"

فن انسان کی ان مساعی پر موقوف ہے جو وہ زندگی کے حقائق سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کرتا ہے۔ یہ بات قرینِ عقل نہیں کہ بڑے بڑے فنکاروں نے اپنی کوششوں کو صرف اس امر پر منحصر رکھا ہوگا کہ ان کے ذریعے تفریحِ طبع کا سامان بہم پہنچایا جائے یا ذہنی بازی گری یا لہو و لعب میسر آئے۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ ان کے کارنامے نوعِ انسانی کی تھکتی ہارتی ہوئی قوتوں کو بحال کرنے اور تازگی اور قوت بخشنے کے لیے تھے۔ تمام فن کا مقصود حسن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ ترفع کے ذریعے یا ایک اعلیٰ نصب العین کی طرف رجوع کرنے سے درجۂ کمال کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ اگر انسان محسوسات ہی کے دائرے میں رہ جائے تو علم جہل آمیز ہو کر حجابِ اکبر بن جاتا ہے۔ مکمل جمال و جلال کی حامل صرف ذاتِ خداوندی ہے اور اسی کے جمال و جلال کی طلب اولیٰ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا سرچشمہ مذہب ہے اور تمام علوم و فنون کا مقصود زندگی کے

تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ قرآن کی زبان میں وہ عبادت ہے۔ عبادت میں حُبِّ الٰہی بھی شامل ہے اور عقل و شعور اور غلبۂ محبت بھی۔ اس طرح عشق ایک رہبر قوت ہے۔ وہ انسان کو دنیا میں عملی طور پر سرگرم رکھتا ہے۔ اس کو تخلیقی کاموں میں لگاتا ہے اور تسخیرِ فطرت کا سبق دیتا ہے۔ یہ عشق ماسوا اللہ کا ابطال کرتا اور حق کو غالب کرنے کی جدوجہد کرنا سکھاتا ہے۔ عشق کا علمبردار گو کہ دنیا ترک نہیں کرتا مگر دنیا پرستی سے اپنا دامن بچاتا ہے۔ وہ مال و متاعِ دنیوی کی ہوس نہیں رکھتا بلکہ آزادی اور بے نفسی پر جان دیتا ہے۔ اس کے دوسرے معاون اوصاف ہیں۔ صبر، توکل، نیاز، فقر، شجاعت، رواداری وغیرہ۔ وہ اوصاف جو دنیا پرستی کے مقابلے میں انسانی خودی کو آزادی اور پاکیزگی عطا کرنے والے ہیں۔

صحیح روحانی طرزِ زندگی ہر فردِ بشر کے لیے ایک سا ہے۔ عملی زندگی میں تقسیم کار کے اصول رائج ہونے سے پہلے شاید عملی زندگی بھی سب انسانوں کے لیے یکساں تھی۔

قرآن کا ارشاد ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (البقرہ ۲۱۳) "ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کجروی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے اور اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق نہیں بتایا گیا تھا۔ نہیں۔ اختلافات ان لوگوں نے کیا جنھیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انھوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔" اس امر کو شدت سے محسوس کرانے کی ضرورت ہے کہ دانشور اور عوام

دونوں ہی انسان ہیں اور ایک ہی خاندان کے افراد۔ مذہب ہی وہ میدان ہے جس میں وہ ایک مشترک مقصد کے لیے سرگرم کار ہو سکتے ہیں۔ البتہ ادیب اور فنکار کے لیے ایک داعیانہ جذبہ ضروری ہے جس سے اسے کارکردگی کی مقصدیت حاصل ہو۔ وہ اپنے قلم کو حق کی امانت سمجھے اور قلم کے ذریعے عبادت کرے۔ تاریخ شعر و ادب گواہ ہے کہ عظیم فن وہاں پھولتا پھلتا ہے جہاں مذہبی اور ثقافتی روایات موجود ہوں۔ جو ادب اپنی روایات سے منحرف ہو وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ اس کا عظیم ہونا تو خارج از بحث ہے فنکار کے لیے دروں بینی ضروری ہے۔ وہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ یا فنکار کائنات اور مخلوق سے کٹ کر اپنی خودی میں کھو جائے یا حقیقتِ مطلق سے براہ راست اپنے باطن کی گہرائیوں میں ایک تعلق پیدا کرے۔ پہلی قسم کی دروں بینی منفی ہے اور علیحدگی پسند اور دوسری مثبت ہے اور وجدانی۔ جو فنکار مذہب سے روشنی حاصل نہیں کرتے۔

[illegible] ہیں وہ قرآن کے ارشاد بغیاً بینہم کے مصداق ہیں۔ وہ اور ان کی کوششیں انتشار، فساد اور تباہی کا باعث ہیں۔ قرآن ان کی اور ان جیسے گراہوں کی مثال یوں بیان کرتا ہے: مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (البقرہ ۲۰/۱۷)

"ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی اور جب اس نے سارے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا۔ اور انھیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ